

امام ابو یوسف اور ان کا کام

ابوالاعلیٰ موودوی

امام ابوحنیفہ کی زندگی میں ان کے سیاسی مسلک اور حکومت کے ساتھ ان کے ترک تعاون کی وجہ سے سلطنت عباسیہ اور حنفی مدرسہ فکر کے تعلقات نہایت کشیدہ ہو چکے تھے، اور یہ اثر بعد میں بھی اچھی خاصی مدت تک باقی رہا۔ ایک طرف اس مدرسے کے اکابر اپنے ترک تعلق پر جے رہے، چنانچہ امام ابوحنیفہ کی وفات کے بعد ان کے نامور شاگرد زفر بن الحذیل دم ۱۵۸ھ (۶۷۷ء) کو جب منصب قضا قبول کرنے پر مجبور کیا گیا تو انہوں نے بھی انکار کر دیا اور جان بچانے کے لیے روپوش ہو گئے۔ دوسری طرف المنصور سے لے کر ہارون الرشید کے ابتدائی عہد تک سلطنت کارجان یہ رہا کہ اس مدرسہ فکر کے اثر کی فراحت کی جائے، اور اسی بنا پر منصور اور اس کے جانشین یہ کوشش کرتے رہے کہ ملک کے نظام قانون کا جو خلا ایک مدون قانون مانگ رہا ہے اسے کسی دوسری تدوین سے بھرا جائے۔ اس غرض کے لیے المنصور اور المہدی نے بھی اپنے اپنے زمانوں میں امام مالک کو سامنے لانا چاہا، اور ہارون الرشید نے بھی ۱۷۴ھ (۷۹۱ء) میں حج کے موقع پر یہ خواہش ظاہر کی کہ ان کی کتاب الموطا کو ملک کا قانون بنایا جائے لیکن آخر کار اس مدرسہ فکر سے ایک ایسی طاقت و شخصیت اٹھی جس نے اپنی اعلیٰ قابلیت اور اپنے زبردست اثر و رسوخ سے سلطنت عباسیہ کے قانونی انتشار کو ختم کیا حنفی فقہ کو ملک کا قانون بنایا اور سلطنت کو ایک آئین پر قائم کر دیا۔ یہ شخصیت امام ابوحنیفہ کے سب سے

۱۔ الحکوری، ج ۲، ص ۱۸۳۔ مفتاح السعاده، ج ۲، ص ۱۱۴

۲۔ ابن عبد البر، الانتقاء، ص ۴۰-۴۱

۳۔ ابو نعیم الاصفہانی، حلیۃ الاولیاء، ج ۶، ص ۳۳۲، المطبقة السعاده، مصر، ۱۳۵۵ھ مفتاح السعاده، ج ۲، ص ۲۴

بڑے شاگرد امام ابو یوسف کی تھی۔

ان کا اصل نام یعقوب تھا عرب کے قبیلہ بھجید سے تھے اور مدینہ کے انصار سے صحابی تعلق اور حلف کے تعلق کی بنا پر ان کا خاندان انصاری کہلاتا تھا کوفہ کے باشندے تھے۔ ۱۱۳ھ ۳۱ء میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد فقہ کو انہوں نے اختصاصی تعلیم کے لیے پسند کیا اور عبدالرحمن بن ابی یعلیٰ کی شاگردی اختیار کی پھر امام ابو حنیفہ کے حلقہ درس میں آئے اور مستقل طور پر انہی سے وابستہ ہو گئے۔ والدین نہایت غریب تھے۔ وہ ان کی تعلیم جاری نہ رکھنا چاہتے تھے۔ امام ابو حنیفہ کو جب ان کے حالات کا علم ہوا تو انہوں نے نہ صرف ان کے مصارف، بلکہ ان کے سارے گھر کے مصارف کی کفالت بھی اپنے ذمے لے لی۔ ان کا اپنا قول ہے کہ مجھے کبھی امام ابو حنیفہ سے اپنی ضرورت بیان کرنے کی حاجت پیش نہیں آئی۔ وقتاً فوقتاً وہ خود ہی میرے گھر آتا روپیہ بھیجتے رہتے تھے کہ میں بالکل بے فکر ہو گیا تھا۔ وہ ابتدا ہی سے اپنے اس شاگرد کے متعلق بہت پُر امید تھے، چنانچہ جب ابو یوسف کے والد نے انہیں مدرسے سے اٹھالینا چاہا تو امام نے فرمایا: ابو اسحاق، یہ لڑکا انشاء اللہ بڑا آدمی بنے گا۔^۱

علیٰ کمالات انہوں نے امام ابو حنیفہ کے علاوہ وقت کے دوسرے بڑے بڑے اساتذہ سے بھی استفادہ کیا اور حدیث، تفسیر، مناجزی، تاریخ عرب، لغت، ادب اور علم کلام میں بھی مہارت پیدا کی خصوصاً حدیث کا وہ وسیع علم رکھتے تھے، حافظ حدیث تھے اور یحییٰ بن معین، احمد بن حنبل اور علی بن المدینی جیسے لوگوں نے ان کو ثقہ قرار دیا ہے۔ ان کے متعلق ان کے ہم عصروں کی متفقہ رائے یہ تھی کہ ابو حنیفہ کے شاگردوں میں کوئی ان کا ہم سر نہ تھا۔ طلحہ بن محمد کہتے ہیں کہ وہ اپنے زمانے کے سب سے بڑے فقیہ تھے۔ کوئی ان سے بڑھ کر نہ تھا۔ داؤد بن رشید کا قول ہے کہ اگر ابو حنیفہ نے صرف یہی ایک شاگرد پیدا کیا ہوتا تو ان کے فخر کے لیے یہ بالکل کافی تھا۔ امام ابو حنیفہ خود ان کی بڑی قرب رکھتے تھے۔

ان کا قول تھا کہ میرے شاگردوں میں سب سے زیادہ جس نے علم حاصل کیا ہے وہ ابو یوسف ہے۔^۲

۱۔ المکی، ج ۲، ص ۱۱۷، ایضاً ص ۱۱۸ ابن حنبلان ج ۵، ص ۲۲۲۔ ابن عبد البر، الانشاء، ص ۱۲۲

۲۔ ابن حنبلان، ج ۵، ص ۲۲۲۔ المکی، ج ۲، ص ۲۲۲۔ انکوری، ج ۲، ص ۱۲۶

ایک دفعہ وہ سخت بیمار ہوئے اور زندگی کی امید نہ رہی۔ امام ابوحنیفہ ان کی عبادت کر کے جب باہر نکلے تو کہنے لگے مدد اگر یہ جوان مر گیا تو اپنے پیچھے اس زمین پر اپنے سے زیادہ بڑا فقیہ چھوڑ کر نہ جائے گا۔
فقہ حنفی کی تدوین | امام ابوحنیفہ کے بعد ۱۶ سال تک یہ بھی اپنے مدرسے کی روایات کے مطابق حکومت سے بے تعلق رہے۔ اس دوران میں انہوں نے اپنے اسناد کے علمی و تعلیمی کام کو جاری رکھا، اور اس کے ساتھ ایک اہم خدمت یہ انجام دی کہ قانون کے اکثر و بیشتر شعبوں کے متعلق الگ الگ کتابیں مرتب کر دیں جن میں امام ابوحنیفہ کی مجلس کے فیصلے اور خود اپنے اقوال باقاعدہ منضبط کر دیئے گئے۔
 کتابیں جب ملک میں پھیلیں تو نہ صرف یہ کہ عام علمی حلقوں کو انہوں نے متاثر کیا، بلکہ عدالتوں اور تمام سرکاری محکموں سے تعلق رکھنے والے لوگوں کی رائے بھی فقہ حنفی کے حق میں جموار کر دی، کیونکہ اس وقت کوئی دوسرا مرتب و منظم قانونی ذخیرہ ایسا موجود نہ تھا جو ان کی ضرورت اس طرح پوری کرتا۔
 امام مالک کی الموطاء اگرچہ جلد ہی ہی میدان میں آگئی، مگر وہ نہ اتنی جامع تھی، نہ تدوین کے اعتبار سے اس قدر واضح کہ ایک حکومت کی ضروریات پوری کر سکتی۔ ابو یوسف کے اس علمی کام کا فائدہ یہ ہوا کہ ان کے برسر اقتدار آنے سے پہلے ہی فقہ حنفی دماغوں اور معاملات پر چھا چکی تھی، اور صرف اس امر کی کسر باقی تھی کہ سیاسی اقتدار باقاعدہ اس کو ملک کا قانون بنا دے۔

منصب نضاء | شاید ابو یوسف بھی اپنے اسناد کی طرح اپنی ساری زندگی حکومت سے عدم تعاون ہی کی روش پر گزار دیتے اگر ان کی معاشی حالت کچھ بھی درست ہوتی لیکن وہ ایک غریب آدمی تھے اور امام ابوحنیفہ کی وفات کے بعد ایک فیاض سرپرست سے بھی محروم ہو چکے تھے۔ آخر انھیں لوہے

۱۶۶ ص ۲۲۲-۲۲۳، ج ۲، ص ۱۶۶

۱۶۶ ص ۲۲۲-۲۲۳، ج ۲، ص ۱۶۶
 ۱۶۶ ص ۲۲۲-۲۲۳، ج ۲، ص ۱۶۶
 ۱۶۶ ص ۲۲۲-۲۲۳، ج ۲، ص ۱۶۶
 ۱۶۶ ص ۲۲۲-۲۲۳، ج ۲، ص ۱۶۶

زمین پر ہر طرف پھیلا دیا۔ ج ۵، ص ۲۲۲-۲۲۳

۱۶۶ ص ۲۲۲-۲۲۳، ج ۲، ص ۱۶۶
 ۱۶۶ ص ۲۲۲-۲۲۳، ج ۲، ص ۱۶۶
 ۱۶۶ ص ۲۲۲-۲۲۳، ج ۲، ص ۱۶۶
 ۱۶۶ ص ۲۲۲-۲۲۳، ج ۲، ص ۱۶۶

یہاں تک پہنچا دی کہ اپنی بیوی کے مکان کا ایک شہتیر تک انہوں نے بیچ ڈالا اور ان کی ساس نے اس پر انہیں کچھ اس طرح ملامت کی کہ ان کی غیرت اسے برداشت نہ کر سکی۔ یہی سبب تھا جس نے انہیں سرکاری ملازمت کرنے پر مجبور کر دیا۔ اس واقعہ کے بعد ۱۶۶ھ ۸۲ء میں وہ بغداد گئے، خلیفہ المہدی سے ملے اور اس نے انہیں شرفی بغداد کا قاضی مقرر کر دیا۔ الہادی کے زمانے میں بھی وہ اسی پوزیشن پر رہے۔ پھر حیب ہارون الرشید کا زمانہ آیا تو رفتہ رفتہ خلیفہ ہارون کا اثر اس قدر بڑھنا چلا گیا کہ آخر کار اس نے انہیں تمام سلطنت عباسیہ کا قاضی القضاة (چیف جسٹس) مقرر کر دیا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلم ریاست میں یہ منصب قائم ہوا۔ اس سے پہلے کوئی شخص خلافت راشدہ یا اموی اور عباسی سلطنتوں میں چیف جسٹس نہیں بنایا گیا تھا۔ اور یہ منصب جس پر امام ابو یوسف مامور کیے گئے، موجودہ زمانے کے تصور کے مطابق محض عدالت العالمیہ کے حاکم اعلیٰ کا نہ تھا بلکہ اس کے ساتھ وزیر قانون کے فرائض بھی اس میں شامل تھے۔ یعنی وہ مقدمات کے فیصلے کرنے اور ماتحت عدالتوں کے قاضی مقرر کرنے کے اختیارات ہی نہ رکھتے تھے بلکہ سلطنت کے تمام داخلی و خارجی معاملات میں قانونی رہنمائی کرنا بھی انہی کا کام تھا۔

اس منصب پر قاضی ابو یوسف کے فائز ہو جانے سے تین اہم نتائج رونما ہوئے۔ ایک یہ کہ ان کو محض ایک حلقہ درس یا گوشہ تصنیف و تالیف میں بیٹھ کر علمی کام کرنے والوں کی بہ نسبت بہت زیادہ وسیع دائرہ عمل بہم پہنچ گیا جہاں اُس وقت کی سب سے بڑی سلطنت کے معاملات سے براہ راست عملاً سابقہ درپیش تھا۔ اس حیثیت میں انہیں فقہ حنفی کو واقعی حالات پر منطبق کر کے اسے زیادہ سے زیادہ ایک عملی نظام قانون بنانے کا موقع مل گیا۔ دوسرے یہ کہ تمام ممالک میں قاضیوں کا عزل و نصب چونکہ انہی سے متعلق تھا، اس لیے حنفی مدرسہ قانون سے تعلق رکھنے والے لوگ مملکت کے بیشتر علاقوں میں قاضی مقرر ہوئے اور ان کے ذریعہ سے فقہ حنفی آپ سے آپ ملک کا قانون بن گئی۔ تیسرے یہ کہ انہوں نے اپنے زبردست اخلاقی اور علمی اثر سے مسلم مملکت کو، جو اموی دور سے

ایک طرح کی بے آئینی اور بادشاہوں کی مطلق العنانی کے ڈھنگ پر چل رہی تھی، بڑی حد تک آئین کا پابند بنا دیا اور اسے ایک کتاب بھی قریب کر کے دی جو خوش قسمتی سے آج بھی وہ کتاب الخراج کی صورت میں ہمارے پاس موجود ہے۔

سیرت کی بلندی اور مضبوطی لیکن قبل اس کے کہ ہم اس آئینی کتاب پر گفتگو کریں، ایک عام غلط فہمی کو رفع کر دینا ضروری ہے۔ امام ابو یوسف کے سوانح نگاروں نے ان کے متعلق کچھ ایسی حکایات بیان کی ہیں جنہیں پڑھ کر آدمی کے سامنے ان کا نقشہ کچھ ایسا آتا ہے کہ گویا وہ بادشاہوں کے خوشامدی اور ان کی خواہشات نفس کے مطابق ثانوی حیثیت کھڑے والے تھے اور یہی خلفاء کے ہاں ان کے تقرب کا ذریعہ تھا۔ حالانکہ ایک معمولی عقل کا آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ جو شخص خوشامد کے ذریعہ سے بادشاہوں کا تقرب حاصل کرے اور ان کی خواہشات کے مطابق شرعی مسائل میں کتر بیونت کرنا رہے، نہ تقرب چاہے کتنا ہی ہو جائے، بادشاہوں پر اس کا اخلاقی اثر کبھی نہیں ہو سکتا۔ اب اگر ہم ان واقعات کو دیکھیں جو خلفاء اور ان کے وزراء اور سپہ سالاروں کے ساتھ ان کے برتاؤ کے متعلق ہمیں مقبر

تاریخوں میں ملتے ہیں تو ہمارے لیے یہ یاد کرنا محال ہو جاتا ہے کہ ایک خوشامدی حیثیت ساز کبھی اس روئے کی جرات کر سکتا ہے۔ خلیفہ اہل ہادی کے زمانہ میں جبکہ وہ محض شرقی بغداد کے قاضی تھے انہوں نے ایک مقدمہ میں خود خلیفہ کے خلاف فیصلہ کیا۔ ہارون الرشید کے زمانہ میں ایک بوڑھے عیسائی نے خلیفہ کے خلاف ایک باغ کا دعویٰ کیا اور قاضی ابو یوسف نے خلیفہ کے رو در رو اس کی نہ صرف سماعت کی بلکہ خلیفہ سے اس کے دعوے کی تردید میں حلف لیا۔ اس پر بھی ابو یوسف مرتے دم تک انہوں سے کہیں نہ کہیں نے خلیفہ کو اس کے برابر کیوں نہ کھڑا کیا۔ ہارون کے وزیر اعظم علی بن عیسیٰ کو انہوں نے ناقابل اعتبار گواہ قرار دیا اور اس کی وجہ یہ بتائی کہ میں نے اس کو ان عبد المجیدہ میں خلیفہ کا غلام ہونے کی خبر سنائی ہے، اگر یہ واقعی غلام ہے تو اس کی شہادت قبول نہیں کی جاسکتی اور اگر یہ خوشامد کی بنا پر

کلمہ الحردی، ج ۲، ص ۱۲۸

۱۵۔ التشریحی، کتاب المبسوط، ج ۱۶، ص ۶۱۔ الملکی، ج ۲، ص ۲۴۴-۲۴۳-۲۴۲

حجوت کہتا ہے تو ویسے ہی ناقابلِ اعتبار ہے۔ یہی اخلاقی سزا اسی طرح کی خوشامد پر انہوں نے ہارون کے ایک سپہ سالار کو بھی دی۔ عبداللہ بن المبارک کا بیان ہے کہ وہ ہارون الرشید کے ہاں اس شان سے جاتے تھے کہ سر پر وہ کے اندر تک ان کی سواری جاتی تھی جہاں وزیر اعظم کو بھی پیدل جانا پڑتا تھا اور خلیفہ خود آگے بڑھ کر سلام کی ابتدا کرتا تھا۔ ہارون سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ آپ نے ابو یوسف کو اتنا اونچا مرتبہ کیوں دیا ہے؟ اس نے کہا میں نے اس شخص کو علم کے جس باب میں بھی جانچا کامل پایا۔ اس کے ساتھ وہ ایک راست رو اور مضبوط سیرت کا آدمی ہے۔ اس جیسا کوئی دوسرا آدمی ہو تو لاؤ۔ ۱۸۲ھ ۷۹۸ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو ہارون الرشید خود ان کے جنازے کے ساتھ پیدل گیا، خود نماز جنازہ پڑھائی، اپنے شاندار قبرستان میں انہیں دفن کیا اور کہا یہ ایسا حادثہ ہے کہ تمام اہل اسلام کو اس پر ایک دوسرے کو تعزیت دینی چاہیے۔ سب سے بڑی شہادت ہمارے پاس ان کی کتاب الخراج ہے۔ اس کے دیباچے ہی کو دیکھ کر آدمی جان سکتا ہے کہ ایک خوشامدی کسی بادشاہ کو مخفی طلب کر کے یہ باتیں نہیں لکھ سکتا۔

کتاب الخراج | قاضی ابو یوسف کو ہارون الرشید کی ذات میں ایک ایسا خلیفہ ملا تھا جو منضا و صفات کا مجموعہ تھا۔ وہ بیک وقت ایک نڈمراج سپاہی بھی تھا، ایک عیش پسند بادشاہ بھی، اور ایک خدا ترس دیندار بھی۔ ابوالفرج الاصبہانی اس کی عفت ایک فقرے میں بیان کرتا ہے کہ وہ وعظ و نصیحت کے موقع پر سب سے زیادہ رونے والا اور غیظ و غضب کے وقت سب سے بڑھ کر ظلم و ستم ڈھانے والا تھا۔ امام ابو یوسف نے اپنے کمال فراست و تدبیر سے اس کے کمزور پہلوؤں کو چھپنے لے لیا۔

۱۷ الملکی، ج ۲، ص ۲۲۷-۲۲۶ حاکم ابنی، ج ۲، ص ۲۴۰

۱۸ الملکی، ج ۲، ص ۲۲۷ - مآ علی قاری، ذیل الجواب المفضیہ، ص ۵۲۶

۱۹ الملکی، ج ۲، ص ۲۳۲ -

۲۰ الملک درمی، ج ۲، ص ۱۲۰

۲۱ کتاب الاغانی، ج ۳، ص ۱۷۸ -

اس کی فطرت کے دینی پہلو کو اپنے علمی و اخلاقی اثر سے متاثر کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا جب اس نے خود انہیں اس کام پر مامور کیا کہ وہ سلطنت کے لیے ایک کتاب آئین مرتب کر دیں تاکہ آئندہ اسی کے مطابق ملک کا انتظام کیا جائے۔ یہی کتاب الخراج کا سبب تالیف تھا جیسا کہ امام موصوف نے اس کے دیباچے میں بیان کیا ہے:

”و امیر المؤمنین ایدہ اللہ تعالیٰ نے مجھ سے یہ چاہا ہے کہ میں ان کے لیے ایک جامع کتاب تیار کروں جس کے مطابق خراج، عسور، صدقات اور چیزوں کی تحصیل میں اور دوسرے اُن معاملات میں عمل کیا جائے جن کے انتظام و انصرام کی ذمہ داری اُن پر ہے۔ . . . انہوں نے کچھ امور کے متعلق سوالات بھی مجھ سے کیے ہیں جن کا وہ تفصیلی جواب چاہتے ہیں تاکہ آئندہ ان امور میں اس پر عمل درآمد ہو۔“

کتاب میں جگہ جگہ انہوں نے ہارون الرشید کے بھیجے ہوئے ان سوالات کے جو حوالے دیئے ہیں ان کو دیکھنے سے گمان ہوتا ہے کہ غالباً یہ ایک سوانامہ تھا جو حکومت کے سکریٹریٹ کی طرف سے اہم و ثقیف قانونی، انتظامی اور بین الاقوامی مسائل کے بارے میں مرتب کیا گیا تھا تاکہ وزارت قانون سے اس کا واضح جواب حاصل کر کے مملکت کا ایک مستقل ضابطہ بنا دیا جائے۔ کتاب کے نام سے بظاہر یہ دھوکا ہوتا ہے کہ صرف خراج (REVENUE) ہی اس کا موضوع ہے، لیکن دراصل وہ مملکت کے قریب قریب تمام معاملات سے بحث کرتی ہے۔ اب ہم اس کی دوسری تفصیلات کو چھوڑ کر صرف اس پہلو سے اس کے مضامین کا جائزہ لیں گے کہ وہ مملکت کا اصولی تصور و نظام کیا پیش کرتی ہے۔

خلافت راشدہ کی طرف عود | سے پہلی چیز جو پوری کتاب کو بغور پڑھنے سے نمایاں طور پر آدمی کے سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ امام ابو یوسف خلیفہ کو نبی امیہ و بنی عباس کی قیصری و کسروی روایات سے ہٹا کر ہر پہلو سے خلافت راشدہ کی روایات کے اتباع کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے اگرچہ کہیں یہ نہیں کہا ہے کہ وہ اپنے پیش رووں کی روایات چھوڑ دے، لیکن کسی جگہ انہوں نے بھولے سے بھی بنی امیہ تو دور کنار خود ہارون الرشید کے باپ دادا کے طرز عمل اور فیصلوں کو بھی نظیر کی حیثیت سے پیش نہیں کیا ہے۔

ہر معاملہ میں وہ یا تو قرآن و سنت سے استدلال کرتے ہیں، یا پھر نظر لاتے ہیں نواب ابو بکر و عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے دور حکومت سے، اور بعد کے خلفاء میں سے اگر کسی کے اعمال کو انہوں نے نظیر بنایا ہے تو وہ المنصور یا المہدی نہیں بلکہ بنی امیہ کے خلیفہ عمر بن عبدالعزیز ہیں۔ اس کے صاف معنی یہ تھے کہ سلطنت عباسیہ کا یہ آئین سلطنت مرتب کرتے وقت انہوں نے عمر بن عبدالعزیز کے دہائی سال کو مستثنیٰ کر کے حضرت علیؓ کی وفات سے لے کر مارون الرشید کے زمانہ تک تقریباً ۳۲ سال کی حکومت کے پورے رواج و تعامل کو نظر انداز کر دیا۔ یہ کام اگر کسی حق گو فتویٰ نے محض وعظ و نصیحت کے طور پر بالکل غیر سرکاری حیثیت میں کیا ہوتا تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہ تھی، لیکن یہ دیکھتے ہوئے اس کی بہت بڑی اہمیت ہو جاتی ہے کہ اسے ایک چھپ چھپس اور وزیر قانون نے اپنی پوری سرکاری حیثیت میں خلیفہ وقت کی سپر کورڈہ ایک خدمت انجام دیتے ہوئے کیا ہے۔

حکومت کا تصور کتاب کے آغاز ہی میں وہ خلیفہ کے سامنے حکومت کا جو تصور پیش کرتے ہیں وہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ ہے:

”اے امیر المؤمنین، اللہ تعالیٰ نے، جو حمد و ثنا کا ایک ہی مستحق ہے، آپ پر ایک بڑے بھاری کام کا بار ڈالا ہے۔ اس کا ثواب سب سے بڑا اور اس کی سزا سب سے زیادہ سخت ہے۔ اس نے اس امت کی سربراہی آپ کے سپرد کی ہے اور آپ شب و روز ایک خلق کثیر کے لیے تعمیر کرتے ہیں۔ اس نے آپ کو ان کا راعی بنایا ہے، ان کی امامت آپ کے حوالے کی ہے ان کے ذریعہ آپ کو آزمائش میں ڈالا ہے، اور ان کے معاملات چلانے کی ذمہ داری آپ کو سونپ دی ہے۔ جو تعمیر عرف خدا کے سوا کسی اور چیز پر کی جائے وہ کچھ دیر نہیں ٹھیرتی کہ اللہ اسے جڑ سے اکھاڑ کر اسی پر گر دیتا ہے جو اس کا بنانے والا اور اس تعمیر میں اس کی مدد کرنے والا ہو۔ راعیوں کو اپنے رب کے سامنے اسی طرح حساب دینا ہے جس طرح دنیا میں کوئی چرواہا گلے کے مالک کو حساب دیتا ہے۔ ٹیڑھی راہ نہ چلیے کہ آپ کا گلہ ٹیڑھا چلنے لگے۔ تمام لوگوں کو خدا کے قانون میں کیساں رکھیے خواہ

آپ سے قریب ہوں یا دور کل خدا کے حضور آپ اس طرح نہ حاضر ہوں کہ آپ زیادتیاں کرنے والوں میں سے ہوں، کیونکہ یوم الدین کا حاکم لوگوں کے فیصلے ان کے اعمال کی بنا پر کرے گا نہ کہ مرتبوں کی بنا پر اس سے ڈریے کہ آپ اپنے گلے کو ضائع کریں اور گلے کا مالک اس کا پورا پورا بدلہ آپ سے لے لے گا۔

اس کے بعد وہ پوری کتاب میں جگہ جگہ ہارون الرشید کو یہ احساس دلاتے ہیں کہ وہ ملک کا مالک نہیں بلکہ اصل مالک کا خلیفہ ہے، اگر وہ امام عادل بنے تو بہترین انجام دیکھے گا اور امام ظالم بن کر رہے تو بدترین عذاب سے دوچار ہوگا۔ ایک جگہ وہ اسے حضرت عمر کا یہ قول سناتے ہیں کہ مد کوئی حق والا بھی دنیا میں اس مرتبے کو نہیں پہنچا ہے کہ خدا کی نافرمانی میں اس کی اطاعت کی جائے۔

روحِ جمہوریت | وہ صرف خدا ہی کے سامنے نہیں بلکہ خلق کے سامنے بھی خلیفہ کے جواب دہ ہونے کا تصور پیش کرتے ہیں اور اس کے لیے مختلف مقامات پر انہوں نے احادیث اور اقوال صحابہ نقل کیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنے فرماؤ اور حکام کے سامنے آزادانہ تنقید کا حق حاصل ہے اور اس آئینہ تنقیدی میں قوم اور حکومت کی خیر ہے۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر مسلمانوں کا حق بھی ہے اور فرض بھی اور اس کا دروازہ بند ہو جانے کے معنی یہ ہیں کہ قوم آخر کار عذابِ عام میں مبتلا ہو جائے۔ فرماؤ میں اتنا تحمل ہونا چاہیے کہ وہ حق بات سے۔ اس کے تشدد خواہ بے برداشت ہونے سے بڑھ کر ضرر رساں کوئی چیز نہیں۔ اور مسلمانوں کو حق ہے کہ رعیت کے جو حقوق فرماؤ اور اپرازروئے شرع عائد ہوتے ہیں اور

۵۲ الخراج، ص ۳-۴-۵۔ المطبعا السلفیہ، مصر، طبع ثانی ۱۳۵۲ھ

۵۳ ایضاً، ص ۵

۵۴ ایضاً، ص ۸

۵۵ ایضاً، ص ۱۱

۵۶ ایضاً، ص ۱۲

۵۷ ایضاً، ص ۱۲

۵۸ ایضاً، ص ۱۰-۱۱

عوام کے مال کی جو امانتیں اس کے سپرد ہیں، ان پر اس سے محاسبہ کریں۔^{۲۹}

خلیفہ کے فرائض | انہوں نے خاص طور پر خلیفہ کے جو فرائض بیان کیے ہیں وہ یہ ہیں: حدود اللہ کو قائم کرنا۔

حق داروں کے حقوق ٹھیک ٹھیک تحقیق کر کے ان کو دلوانا۔ صالح حکمرانوں کے دستور العمل کو دیکھنے

مانشی کی ظالم حکومتمنوں نے ترک کر دیا تھا، زندہ کرتا۔ ظلم کو روکنا اور عوام کی شکایات کو تحقیق کے بعد رفع

کرنا۔ اللہ کے احکام کے مطابق لوگوں کو طاعت کا حکم دینا اور معصیت سے روکنا۔ خدا کے قانون کو

اپنے اور غیر سب پر یکساں نافذ کرنا اور اس معاملے میں اس بات کی پروا نہ کرنا کہ اس کی زد کس پر پڑتی ہے۔^{۳۰}

جانے طور پر لوگوں سے محاصل لینا اور جائز راستوں میں انہیں خرچ کرنا۔^{۳۱}

مسلم شہریوں کے فرائض | دوسری طرف وہ اپنے حکمرانوں کے معاملے میں مسلمانوں کے جو فرائض بتاتے ہیں وہ یہ

ہیں: ان کی اطاعت کریں، نافرمانی نہ کریں۔ ان کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائیں۔ ان کو برا بھلا نہ کہیں۔ ان کی

سختیوں پر صبر کریں۔ ان کو دھوکا نہ دیں۔ ان کے ساتھ پتے دل سے خیر خواہی برتیں۔ ان کو برا بیٹوں سے

روکنے کی کوشش کریں۔ اور صحیح کاموں میں ان کی مدد کریں۔^{۳۲}

بیت المال کی ذمہ داری | بیت المال کو وہ بادشاہ کی ملکیت کے بجائے خدا اور خلق کی امانت قرار دیتے

ہیں اور خلیفہ کو متعدد مواقع پر حضرت عمر کے وہ اقوال سناتے ہیں جن میں انہوں نے کہا ہے کہ حکومت کے

نخرانے کی حیثیت خلیفہ کے لیے ایسی ہے جیسے ولی تنیم کے لیے تنیم کے مال کی حیثیت ہوتی ہے۔ اگر وہ

غنی ہو تو اسے قرآن کی ہدایت کے مطابق مال تنیم میں سے کچھ نہ لینا چاہیے اور فی سبیل اللہ اس کی

۲۹ الخراج، ص ۱۱۷ -

۳۰ الخراج، ص ۵

۳۱ ایضاً، ص ۶

۳۲ ایضاً، ص ۱۳

۳۳ ایضاً، ص ۱۰۸

۳۴ ایضاً، ص ۹-۱۲

جانداد کا انتظام کرنا چاہیے۔ اور اگر وہ حاجت مند ہو تو معروف طریقہ سے اتنا حق الخیر مت لینا چاہیے جسے ہر شخص جائز تسلیم کرے۔^{۵۵} وہ حضرت عمر کے اس طرز عمل کو بھی خلیفہ کے سامنے نمونے کے طور پر رکھتے ہیں کہ وہ بیت المال سے خرچ کرنے میں اس سے بھی زیادہ جزیسی برتنے تھے جتنی کوئی شخص اپنے مال سے خرچ کرنے میں برتنا ہے۔ اس سلسلے میں وہ اس واقعہ کا ذکر کرتے ہیں کہ حضرت عمر نے کوفہ کے قاضی، امیر اور افسر مالگناری مقرر کرتے ہوئے تینوں کے خاندان کی خوراک کے لیے روزانہ ایک بکری دینے کا حکم دیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ "جس زمین سے روز ایک بکری افسروں کے لیے لی جائے وہ تو جلدی بر باد ہو جائیگی"۔^{۵۶} وہ خلیفہ سے یہ بھی کہتے ہیں کہ اپنے حکام کو سرکاری مال ذاتی استعمال میں لانے سے روک دے۔

ضرب محاصل کے اصول | ٹیکس عائد کرنے کے بارے میں جو اصول وہ بیان کرتے ہیں وہ یہ ہیں: لوگوں کے صرف زائد از ضرورت اموال پر ٹیکس عائد کیا جائے۔ ان کی رضامندی سے ان پر بار ڈالا جائے۔ کسی پر اس کی قوت برداشت سے زیادہ بار نہ ڈالا جائے۔ مال داروں سے لیا جائے اور غریب طبقوں پر خرچ کیا جائے۔^{۵۷} محاصل کی تشخیص اور ان کی شرح کی تعیین میں اس بات کا پورا خیال رکھا جائے کہ حکومت لوگوں کا خون نہ چوس لے تحصیل میں ظالمانہ طریقوں سے کام نہ لیا جائے۔^{۵۸} از روئے قانون مقرر کیے ہوئے محاصل کے سوا کسی قسم کے ناجائز ٹیکس نہ حکومت لے اور نہ مالکان زمین یا اپنے عالموں کو لینے دے۔ جو ذمی مسلمان ہو جائیں ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔^{۵۹} اس سلسلے میں وہ خلفائے راشدین کے طرز عمل کو بطور نمونہ

۵۵ الخراج، ص ۳۶-۱۱۷

۵۶ ایضاً، ص ۳۶

۵۷ ایضاً، ص ۱۸۶

۵۸ ایضاً، ص ۱۴

۵۹ ایضاً، ص ۱۶-۳۷-۱۰۹-۱۱۴

۶۰ ایضاً، ص ۱۰۹-۱۳۲

۱۱ ایضاً، ص ۱۲۲-۱۳۱

و نظیر پیش کرتے ہیں۔ مثلاً حضرت علیؑ یہ واقعہ کہ انہوں نے اپنے عامل کو عوام کے سامنے ہدایات دیتے ہوئے تو یہ کہا کہ ان سے پورا پورا اخراج وصول کرنا اور زرار عایت نہ کرنا، مگر علیؑ کی میں بلا کر اسے سخت ہدایت کی کہ خبردار کسی کو مار پیٹ کر یا دھوپ میں کھڑا کر کے خراج وصول نہ کرنا اور نہ ایسی سختی کرنا کہ وہ سرکاری واجبات ادا کرنے کے لیے اپنے کپڑے یا رتن یا جانور بیچ دینے پر مجبور ہو اور حضرت عمرؓ کا یہ طریقہ کہ وہ اپنے افسران بند و بست پر جرح کر کے یہ اطمینان کر لیتے تھے کہ کاشتہ کاروں پر مانگداری تشخیص کرنے میں ان کی کمر توڑ دینے سے احتساب کیا گیا ہے، اور جب کسی علاقے کے محاصل آتے تھے تو عوام کے نمائندوں کو بلا کر گواہیاں لی جاتی تھیں کہ کسی مسلمان یا ذمی مزارع پر ظلم ڈھا کر تحصیل نہیں کی گئی ہے۔

غیر مسلم رعایا کے حقوق | اسلامی ریاست کی غیر مسلم رعایا کے بارے میں امام ابو یوسف حضرت عمر کے حوالہ سے تین اصول بار بار اس کتاب میں نقل کرتے ہیں (۱) جو عہد بھی ان سے کیا گیا ہو اسے پورا کیا جاتے، (۲) مملکت کے دفاع کی ذمہ داری ان پر نہیں بلکہ مسلمانوں پر ہے اور (۳) ان کی طاقت سے زیادہ ان پر جزیہ اور مانگداری کا بوجھ نہ ڈالا جائے۔ پھر وہ بتاتے ہیں کہ مسکین، اندھے، بوڑھے، لاہب، عبادت گاہوں کے کارکن، عورتیں اور بچے جزیہ سے مستثنیٰ ہیں۔ ذمیوں کے اموال اور مویشی پر کوئی زکوٰۃ نہیں۔ ذمیوں سے جزیہ وصول کرنے میں مار پیٹ اور سبانی ایذا سے کام لینا جائز نہیں۔ عدم ادائیگی کی پاداش میں زیادہ سے زیادہ صرف قید کیا جاسکتا ہے۔ مقرر جزیہ سے زائد کوئی چیز ان سے وصول کرنا حرام ہے۔ اور معدودہ محتاج ذمیوں کی پرورش حکومت کے خزانہ سے کی جانی چاہیے۔ وہ تاریخی واقعات پیش کر کے یہ بات بارون الرشید کے ذہن نشین کرتے ہیں کہ ذمیوں کے ساتھ فیاضانہ اور شریفانہ سلوک کرنا خود مملکت کے لیے مفید ہے۔ حضرت

۱۴۱۵ھ الخراج، ص ۱۰۱۵

۱۴۲۱ھ ایضاً، ص ۳۶، ۱۱۴

۱۴۲۲ھ ایضاً، ص ۱۴ - ۲۴ - ۱۲۵

۱۴۲۵ھ ایضاً، ص ۱۲۲، ۱۲۶

عمر کے زمانہ میں اسی زناؤ کی وجہ سے شام کے عیسائی خود اپنے ہم مذہب رومیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کے وفادار و غیر خواہ بہرے تھے۔

زمین کا بندوبست | زمین کے بندوبست کے سلسلہ میں امام ابو یوسف زمینداری کی اس قسم کو حرام قرار دیتے ہیں جس میں حکومت کا منتکاروں سے مالگزارى و معمول کرنے کے لیے ایک شخص کو ان پر زمیندار بنا کر ٹھہراتی ہے اور اسے عملاً یہ اختیار دے دیتی ہے کہ حکومت کا مکان اور گرنے کے بعد باقی جو کچھ جس طرح چاہے منتکاروں سے وصول کرنا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ رعیت پر سخت ظلم اور ملک کی بربادی کا موجب ہے اور حکومت کو یہ طریقہ بھی اختیار نہ کرنا چاہیے۔ اسی طرح وہ اس طریقے کو بھی قلعی حرام قرار دیتے ہیں کہ حکومت کسی کی زمین لے کر کسی کو جاگیر میں دے دے۔ وہ کہتے ہیں کہ امام اس کا مجاز نہیں ہے کہ کسی مسلمان یا ذمی کے قبضے سے کوئی چیز نکال لے جب تک کہ انہوں نے قانون اس پر کوئی ثابت یا معروف حق واجب نہ آتا ہو۔ من مانے طریقے پر لوگوں کی ملکیتیں چھین کر دوسروں کو عطا کرنا ان کے نزدیک بڑا کر مار کر بخشش کرنے کا ہم معنی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زمین کے عطیے صرف اس صورت میں جائز ہیں جبکہ غیر آباد اور غیر ملوکہ زمینیں، یا ال وارث منہ و کہ الارضی، آباد کاری کی اغراض کے لیے یا خیمتی اجتماعی خدمات کے صلے میں، انعام کے طور پر، معقول حد کے اندر دی جائیں۔ اور اس طرح کا عطیہ بھی جس شخص کو دیا جائے وہ اگر تین سال تک اس کو آباد نہ کرے تو اس سے واپس لے لیا جانا چاہیے۔

ظلم و ستم کا انسداد | پھر وہ با من الرشید سے کہتے ہیں کہ ظالم اور فاسق لوگوں کو حکومت کی خدمات میں استعمال کرنا اور انہیں محکوموں کا افسر یا علاقوں کا حاکم مقرر کرنا آپ کے لیے حرام ہے۔ اس صورت میں جو ظلم بھی وہ کریں گے اس کا وبال آپ کے اوپر پڑے گا وہ بار بار کہتے ہیں کہ آپ صلح، متدین اور

۷۶ الخراج، ص ۱۳۹

۷۷ ایضاً، ص ۱۰۵

۷۸ ایضاً، ص ۵۸-۶۰-۶۶

۷۹ ایضاً، ص ۶۶ تا ۶۹

۷۷ ایضاً، ص ۱۱۱

خدا ترس لوگوں کو اپنی حکومت کے کاموں میں استعمال کریں، جن لوگوں کو کبھی سرکاری خدمات کے لیے چاہتا ہے ان کی اہمیت کے ساتھ ان کے اخلاقی کی طرف سے بھی اطمینان کر لیا جائے، اور پھر ان کے پیچھے قابو ہے۔
غیر لگا دیئے جائیں تاکہ اگر وہ بگڑیں اور ظلم و ستم یا خیانت کرنے لگیں تو بروقت خلیفہ کو ان کے اعمال کا حال معلوم ہو جائے اور ان سے محاسبہ کیا جاسکے۔^{۵۱} وہ ہارون سے یہ بھی کہتے ہیں کہ خلیفہ کو خود براہ راست عوام کی شکایات سننی چاہئیں۔ اگر وہ جہیزے میں ایک دن بھی اجلاس عام کرے جس میں ہر مظلوم اگر اپنی شکایت پیش کر سکے اور حکومت کے افسر جان لیں کہ خلیفہ تک براہ راست ان کے افعال کی اطلاعات پہنچ سکتی ہیں تو ظلم و ستم کا سدباب ہو جائے۔^{۵۲}

عدلیہ | عدلیہ کے بارے میں وہ کہتے ہیں کہ اس کا فریضہ انصاف اور بے لاگ انصاف ہے۔ جو منرا کا مستحق ہو اسے منرا دینا، اور جو مستحق نہ ہو اسے منرا دینا دونوں یکساں حرام ہیں۔ شہادت میں منرا نہ دی جانی چاہیے۔ معاف کرنے میں غلطی کرنا منرا دینے میں غلطی کرنے سے بہتر ہے۔ انصاف کے معاملے میں ہر قسم کی مداخلت اور سفارش کا دروازہ بند ہونا چاہیے۔ اور کسی شخص کے مرتبے یا حیثیت کا قطعاً لحاظ نہ ہونا چاہیے۔^{۵۳}

شخصی آزادی کا تحفظ | وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ کسی شخص کو محض تہمت کی بنا پر قید نہیں کیا جاسکتا۔ لازم ہے کہ جس شخص کے خلاف کوئی الزم ہو اس پر باقاعدہ مقدمہ چلایا جائے، شہادتیں لی جائیں، اگر جرم ثابت ہو تو قید کیا جائے ورنہ چھوڑ دیا جائے۔ وہ خلیفہ کو مشورہ دیتے ہیں کہ تمام لوگ جو قید خانوں میں محبوس ہیں ان کے معاملے کی تحقیقات ہونی چاہیے، بلا ثبوت و شہادت جو لوگ بھی قید ہوں انہیں رہا کر دینا چاہیے، اور آئندہ کے لیے تمام گورنروں کو احکام دینے چاہئیں کہ کسی شخص کو محض الزامات اور تہمتوں کی بنا پر مقدمہ چلائے بغیر قید نہ کیا جائے۔^{۵۴} وہ اس بات کو بھی فہم دے زور کے ساتھ کہتے

۱۵۱ الخراج، ص ۱۰۹-۱۰۷-۱۱۱-۱۲۲-۱۸۶

۱۵۲ ایضاً، ص ۱۱۱-۲۱۲ ۱۵۳ ایضاً، ص ۱۵۲-۱۵۳

۱۵۴ ایضاً، ص ۱۶۵-۱۶۶

ہیں کہ ملزموں کو محض نہبت کی بنا پر مارنا پیننا خلافِ قانون ہے۔ شرعاً ہر آدمی کی پیٹھ اس وقت تک محفوظ ہے جب تک عدالت سے وہ مزید تازیانہ کا مستحق نہ قرار پایا جائے۔

جیل کی اصلاحات | انہوں نے جیل کے بارے میں جو اصلاحات تجویز کی ہیں ان میں وہ کہتے ہیں کہ جس شخص کو قید کیا جائے اس کا یہ حق ہے کہ اسے حکومت کے خزانے سے روٹی کپڑا دیا جائے۔ وہ شدت کے ساتھ اس طریقے کی مذمت کرتے ہیں جو نبی امیہ و بنی عباس کی حکومتوں میں رائج ہو گیا تھا کہ قیدیوں کو روزانہ تنہہ کرپوں اور پیرلوں کے ساتھ باہر لے جایا جاتا تھا اور وہ بھیک مانگ کر روٹی کپڑا اپنے لیے لاتے تھے۔ وہ تلیف سے کہتے ہیں کہ یہ طریقہ نید ہونا چاہیے اور قیدیوں کو سرکار کی طرف سے گرمی جاڑے کا کپڑا اور سیٹ بھر کا کھانا ملنا چاہیے۔ اسی طرح وہ اس بات کی بھی سخت مذمت کرتے ہیں کہ لاوارث قیدی جب مر جاتا ہے تو اسے بلا غسل و کفن اور بلا نماز جنازہ گاڑ دیا جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اہل اسلام کے لیے یہ بڑے شرم کی بات ہے۔ ایسے قیدیوں کی تجہیز و تکفین اور نماز جنازہ کا انتظام سرکار کی طرف سے ہونا چاہیے۔ انہوں نے یہ بھی سفارش کی ہے کہ جیل میں کسی قیدی کو قتل کے مجرمین کے سوا، باندھ کر نہ رکھا جائے۔

ان کے کام کی اصل قدر و قیمت | یہ خلاصہ ہے ان آئینی تجاویز کا جو امام ابو یوسف نے اسے ۱۲ سو برس پہلے ایک مطلق العنان فرمانروا کے سامنے اس کے وزیر قانون اور قاضی القضاة کی حیثیت سے پیش کی تھیں۔ اگر ان کو اسلامی ریاست کے بنیادی اصولوں اور خلافت راشدہ کے دستور اور خود ان کے استاد امام ابوحنیفہ کی تعلیمات کے مقابلہ میں دیکھا جائے تو یہ ان سے بہت کم نظر آتی ہیں۔ ان میں انتخابی خلافت کے تصور کا شائبہ۔

نہیں ہے۔ ان میں شوریٰ کے ذریعہ سے حکومت کرنے کا بھی کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ اس تصور سے بھی خالی ہیں کہ امام ظالم کو حکومت کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور خلق اس کی مجاز ہے کہ اس کی

حکومت کی حکیم بہتر حکومت لانے کی کوشش کرے۔ اسی طرح دوسری متعدد حیثیات سے بھی یہ تجاویز اسل اسلامی تصور کے مقابلے میں بہت ناقص ہیں۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ امام ابو یوسف کے تصور ریاست کی وسعت بس اتنی ہی ہے جتنی کتاب الخراج کی ان تجاویز میں پائی جاتی ہے اور وہ درحقیقت اس سے زیادہ کچھ نہ چاہتے تھے جو انہوں نے اس کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ بلکہ دراصل یہ وہ زیادہ سے زیادہ چیز تھی جس کی ایک عملی مفکر کی حیثیت سے وہ سلطنت عباسیہ کے اُس دور میں توقع کر سکتے تھے۔ ان کے پیش نظر محض ایک ایسا خیالی نقشہ پیش کرنا نہ تھا جو تصور کی حد تک مکمل ہو مگر واقعی حالات میں اس کو جامہ عمل پہنانے کے امکانات نہ ہوں۔ اس کے بجائے وہ ایک ایسی آئینی اسکیم مرتب کرنا چاہتے تھے جو اسلامی ریاست کے کم سے کم جوہر مطلوب کی حامل بھی ہو اور اس کے ساتھ اسے ان حالات میں رد و عمل بھی لایا جاسکتا ہو۔